مِلاكُ التأوِيل (۷)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورۃ آل عمران

(۱) **آیت** ۳ اور ۴:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

''جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب کو اُتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والی ہے۔''

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③﴾

''اور تورات اور انجیل کو اتارا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اَلْکِتٰب'' سے پہلے نَزَّلَ (''ز'' پر تشدید کے ساتھ) ارشاد فرمایا اور تورات اور انجیل سے پہلے ''اَنْزَلَ'' کا ذکر کیا تو اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''نَزَّلَ'' میں تشدید کی بنا پر تکرار کا مفہوم غالب ہے' جیسے اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے: ضَرَبَ: تو اس سے ایک دفعہ مارنا مراد ہوگا۔ گو اس میں زیادتی کا احتمال ہے' تاہم چونکہ ''ضَرَبَ'' یہاں بغیر تشدید کے ہے اس لیے اس میں کمی زیادہ مناسب ہے' لیکن اگر ''ضَرَّبَ'' تشدید کے ساتھ کہا جائے تو بار بار مارنا مراد ہوگا۔ (جیسے نبی اکرم ﷺ نے ابوجہم کے بارے میں فرمایا: ((فَهُوَ ضَرَّابٌ لِلنِّسَاءِ)) کہ وہ تو اپنی بیویوں کو بہت زیادہ مارنے والا ہے۔) (مترجم)

اس لیے ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب کو حالات کے مطابق قسطوں میں اتارا گیا ہے اور اس کا نزول صرف ایک مرتبہ نہیں ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں تورات اور انجیل کے لیے ''اَنْزَلَ'' کا لفظ لایا گیا کہ وہ ایک وقت ہی میں اتاری گئی تھیں۔ دیکھئے تورات کے بارے میں سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ......﴾ (آیت ۱۴۵)

''اور ہم نے اُس کے لیے تختیوں پر ہر چیز کے بارے میں لکھ دیا جو کہ ہر چیز کے لیے تفصیل بھی ہے اور باعثِ نصیحت بھی ہے' تو پھر اسے مضبوطی سے پکڑلو......''

اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو وہ ابتداءِ وحی سے انتہا تک بالاقساط اتارا گیا۔ ابتداء سورۃ العلق سے ہوئی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ①﴾

''اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا۔''

اور پھر آخری عمر میں رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات اتریں:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾

(المائدۃ:۳)

''آج تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کرلیا۔''

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫﴾ (البقرۃ: ۲۸۱)

''اور اُس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

اور چونکہ قرآن بالاقساط اُتر رہا تھا اسی لیے کفار نے مطالبہ کیا:

﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ (الفرقان:۳۲)

''اس (نبی ﷺ) پر قرآن کو یک بارگی کیوں نہ اُتارا گیا؟''

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (الفرقان:۳۲)

''تاکہ اس طرح ہم آپ کے دل کو ثابت قدم رکھ سکیں۔''

سورۃ النساء میں بھی قرآن اور تورات کے ذکر میں اسی فرق کو روا رکھا گیا ہے' فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اپنے رسول پر اتاری۔''

مراد قرآن ہے' اور پھر کہا:

﴿وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اور اُس کتاب پر بھی جسے پہلے اتارا تھا (یعنی تورات)''

البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ان سب کتابوں کے لیے لفظ ''اَنْزَلَ'' بھی لایا گیا ہے جب کہ ان کتابوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہو' یا ذکر تو اکٹھا ہو لیکن بغیر ''الف لام'' کے ہو (جیسے ''الکتاب'' میں الف لام لاکر ایک مخصوص کتاب یعنی قرآن کی طرف اشارہ ہے۔)

پہلی بات کی مثال' جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ﴾ (الکھف: ۱)

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری''

اور دوسری بات کی مثال' جیسے کہ یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ﴾ (البقرۃ: ۴)

''اور وہ ایمان لاتے ہیں اُس پر جو تمہارے اوپر اتارا گیا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا۔''

اور ایسے ہی سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ﴾ (آیت ۵۹)

''اور جو ہم پر اتارا گیا اور جو پہلے اتارا گیا۔''

اور قرآن میں اس طرح کثرت سے آیا ہے' اور ایسی جگہوں پر حرف ''مَا'' لایا گیا' جو ہے تو موصول کے معنوں میں لیکن اس میں وہ قوت نہیں ہے جو ''الَّذِیْ'' میں پائی جاتی ہے یا ''الف لام'' میں' اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ یہاں کسی کتاب کا نام کے ساتھ بھی ذکر نہیں ہے اور وہ اس لیے کہ ''مَا'' میں ابہام پایا جاتا ہے اور اس میں عہد (یعنی ''الکتاب'' کے ال کی طرح کسی خاص کتاب کی طرف اشارہ کا ہونا) نہیں پایا جاتا۔ برخلاف ''الّذی'' کے جس میں عہد کا پایا جانا ضروری ہے۔

اب اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ دونوں کتابوں کا نام کے ساتھ یا ''الَّذِی'' کے ساتھ ذکر آ جائے تو پھر مندرجہ بالا تفریق کے ساتھ ذکر ہو گا' یعنی قرآن کے لیے ''نَزَّلَ'' (تشدید کے ساتھ) اور غیر قرآن کے ساتھ اَنْزَلَ (بغیر تشدید) لایا جائے گا' کیونکہ مشدّد لفظ میں بالاقساط اور تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ تورات کے لیے قرآن میں ایک مرتبہ تنزیل (تشدید کے ساتھ) کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا:

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ﴾ (آل عمران: ۹۳)

''اس سے پہلے کہ تورات اتاری گئی۔''

یہاں نَزَّلَ (تشدید کے ساتھ) لانے میں ایک اور چیز کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی تورات کے احکام کا ثابت ہو جانا اور ان کا پکا ہو جانا۔ اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی کہ ان پر جو کچھ حرام ہوا ہے ان کے اپنے ظلم اور زیادتی کی بنا پر ہوا ہے' فرمایا:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ (النساء: ۱۶۰)

''جن لوگوں نے یہودیت کو اپنایا' ان کے ظلم کی بنا پر ہم نے ان پاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دے دیا جو ان کے لیے حلال تھیں۔''

﴿وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ﴾ (الانعام: ۱۴۶)

''اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ہم نے ان پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے نبی ﷺ کو اور جماعت مؤمنین کو بھی بتا دی تو بنی اسرائیل نے اس بات کا انکار

کیا کہ یہ معاملہ صرف انہی کے ساتھ کیا گیا ہے‘ بلکہ اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ چیزیں تو ان سے پہلے نوحؑ‘ ابراہیمؑ اور تمام دوسرے لوگوں پر بھی حرام تھیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ان کی بات کو جھٹلایا:

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِھٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ﴾ (آل عمران:۹۳)

’’تمام قسم کا کھانا (یعنی ذبیحہ) بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا سوائے اس کے جسے اسرائیل (یعنی یعقوبؑ) نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا۔‘‘

یعنی تورات کے نازل ہونے‘ اس کے احکامات کے دلوں میں جاگزیں ہونے سے قبل‘ وہ اپنے نفس پر بعض چیزوں کو حرام کر چکے تھے۔ چونکہ یہاں تورات کے احکامات کا اچھی طرح دلوں میں جڑ پکڑ لینے کی طرف اشارہ مقصود تھا اس لیے بجائے ’’اَنْزَلَ‘‘ کے ’نَزَّلَ‘ بالتشدید لایا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوائے اس جگہ کے کہیں اور یہ لفظ تورات کے لیے نہیں لایا گیا۔

ابوالفضل بن خطیب نے بھی آل عمران کی ابتدائی آیات ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳﴾ کی تفسیر میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں لکھ چکا ہوں لیکن پھر کہا کہ چونکہ قرآن کے ساتھ بھی ’’اَنْزَلَ‘‘ کا لفظ لایا گیا ہے جیسے آیت سورۃ الکہف: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (آیت ۱) اس لیے یہاں اشکال پیدا ہو جاتا ہے‘ لیکن ہماری دی گئی وضاحت سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔ والحمد للہ!

[**اضافات از مترجم**: عبدالرحمٰن کیلانی ’مفردات القرآن‘ میں لکھتے ہیں:

بعض علماء کا خیال ہے کہ اَنْزَلَ کا لفظ بلندی سے کوئی چیز یکبارگی اتارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے‘ جیسے ارشادِ باری ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر)

’’ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں اتارا۔‘‘

اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس رات کو آسمانِ دنیا پر تو یکبارگی نازل ہو گیا۔ بعد میں حسبِ ضرورت بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا۔

اب تک جو کچھ تحریر میں لایا گیا ہے اس میں پھر بھی کچھ اشکال باقی ہیں مثلاً:

(۱) اَنْزَلَ اور نَزَّلَ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ اَنْزَلَ ایک دفعہ اتارنے کے لیے اور نَزَّلَ بالاقساط اتارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو پھر تورات کے لیے نَزَّلَ کا لفظ کیوں لایا گیا؟ (ابن الزبیر نے اس کا جواب دیا ہے لیکن یہ جواب شافی و کافی نہیں ہے۔)

(۲) بقول ابوالحیان سورۃ الفرقان کی اس آیت میں نَزَّلَ کا لفظ ایک دفعہ نازل ہونے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ (آیت ۳۲)

’’اور کافروں نے کہا: اس پر قرآن ایک دفعہ اکٹھا کیوں نہ نازل کیا گیا؟‘‘

(۳) یہ کہاں سے فرض کر لیا گیا ہے کہ تورات اور انجیل ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی تھیں' بالاقساط نہیں اُتاری گئی تھیں' کیونکہ قرآن کی مانند ان دونوں کتابوں کی آیات بھی حسب ضرورت اور حالات کے مطابق نازل کی جاتی رہی تھیں۔

علامہ محمد الطاہر بن عاشور کی تفسیر مندرجہ بالا اشکالات کا شافی و کافی جواب رکھتی ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی تفسیر اور مقدمہ اولیٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

نَزَّلَ میں تضعیف (یعنی تشدید) اَنْزَلَ کے زائد حرف ''أ'' کی جگہ پر ہے' البتہ بغیر تشدید والے فعل کے مقابلے میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس میں قوت کا اظہار ہوتا ہے' جیسے:

فَسَرَ اور فَسَّرَ' فَرَقَ اور فَرَّقَ' کَسَرَ اور کَسَّرَ' تشدید والے فعل میں زیادہ قوت کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے کَسَرَ کا مطلب ہے توڑا' لیکن کَسَّرَ کا مطلب ہے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب دیکھئے کچھ افعال جو متعدی نہیں ہیں' وہاں پر بھی تشدید لا کر قوت کا اظہار ہو رہا ہے' جیسے مَاتَ اور مَوَّتَ' صَاحَ اور صَیَّحَ اب اگر فعل مشدّد تعدیہ کے لیے ہو (یعنی اس کا مفعول بھی آ رہا ہو) تو میرے خیال میں وہ اَنْزَلَ کے ہمزہ کے مقابلے میں ہوتا ہے اور اس میں بذاتِ خود قوت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا اِلا یہ کہ یہ کہا جائے کہ اگرچہ دونوں الفاظ کا معنی تو ایک ہی ہے یعنی اتارنا لیکن نَزَّلَ میں اَنْزَلَ کے مقابلے میں الکتاب کی رفعت شان کی طرف اشارہ ہے۔ بالاقساط اتارنے کا مفہوم نہیں ہے۔ اور اسی لیے بقول ابوحیان سورۃ الفرقان کی آیت میں یک بارگی اتارنے کے لیے بھی نَزَّلَ کا لفظ لایا گیا' کہ اس لفظ کے لانے سے قرآن کی عظمت کی طرف تو اشارہ ملتا ہے لیکن بالاقساط اتارے جانے کا مطلب نہیں لیا گیا یعنی چاہے اَنْزَلَ ہو یا نَزَّلَ' اصل مقصود اتارا جانا ہے جو یکبارگی بھی ہو سکتا ہے اور بالاقساط بھی' اور چونکہ تورات اور انجیل بھی دوسرے صحفِ سماویہ کی طرح بالاقساط نازل ہوئی تھیں' اس لیے اَنْزَلَ اور نَزَّلَ میں فرق روا نہیں رکھنا چاہیے۔

اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ نَزَّلَ میں کثرت اور رفعت شان کا مفہوم غالب ہے۔ زمخشری نے الکشاف کے خطبہ الکتاب میں یوں لکھا:

الحمد للّٰہ الّذی اَنْزَلَ الْقُرآن کلامًا مؤلفًا منظّمًا وَنَزَّلَہٗ علی حسبہ المصالح منھما

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے قرآن کو بحیثیت ایک مربوط اور منظّم کلام کے اتارا اور پھر اسے حسب ضرورت بالاقساط اُتارا''

کشّاف کے شارحین لکھتے ہیں کہ علامہ نے یہاں اَنْزَلَ اور نَزَّلَ دونوں لفظ استعمال کیے ہیں اور نَزَّلَ کا لفظ لا کر اس کثرت کی طرف اشارہ کر دیا جو قرآن کو بالتدریج اور بالاقساط لانے کا تقاضا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اَنْزَلَ کے بجائے نَزَّلَ (یعنی ہمزہ کے بجائے تشدید) لانے میں اصل معنی میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا' یعنی دونوں کا مطلب ہے اُتارنا' لیکن لفظ خفیف (جیسے اَنْزَلَ) سے لفظ ثقیل (جیسے نَزَّلَ) کو اختیار کرنا' اس کی کثرت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

ابن عاشور کے کلام سے واضح ہو گیا کہ اَنْزَلَ اور نَزَّلَ دونوں کا مطلب اُتارا جانا ہے اس لیے یہ دونوں الفاظ قرآن کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں قرآن کے لیے نَزَّلَ کا لفظ لایا گیا ہے وہاں قرآن کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کے کثیر ہونے کا بھی' اور یہ کثرت اس کے بالاقساط اتارے جانے کا بھی تقاضا ہے۔ چونکہ تورات میں بھی یہ کثرت پائی جاتی ہے اس لیے اس کے لیے بھی قرآن میں کم ازکم ایک دفعہ ''نَزَّلَ'' کا لفظ لایا گیا ہے۔]

(۲) آیت ۱۱:

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪﴾

''جیسا آلِ فرعون کا حال ہوا اور ان کا جو ان سے پہلے تھے' انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے بھی ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا' اور اللہ سخت سزا دینے والے ہیں۔''

اور سورۃ الانفال کی آیت ۵۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۵۲﴾

''انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا' یقیناً اللہ طاقتور ہیں اور سخت سزا دینے والے ہیں۔''

اور اسی سورت کی آیت ۵۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۵۴﴾

''انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کی بنا پر انہیں ہلاک کیا اور آلِ فرعون کو غرق کیا' اور یہ سب ظلم کرنے والے تھے۔''

یہاں پر چھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) آلِ فرعون کے بارے میں دو جگہ پر كَذَّبُوْا (آلِ عمران' اور الانفال کی دوسری آیت) اور ایک جگہ پر ''كَفَرُوْا'' (الانفال کی پہلی آیت) لایا گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) ان کی طرف تکذیب کی نسبت تین مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے:

آلِ عمران میں: بِاٰيٰتِنَا

الانفال میں: بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اور الانفال کی دوسری آیت میں: بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ کہا گیا۔ کیوں؟

(۳) ان کے انجام میں دو مختلف لفظ لائے گئے:

الانفال کی دوسری آیت میں: فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

اور باقی دونوں آیات میں: فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ لایا گیا۔

(۴) آلِ عمران کی آیت کا اختتام اس جملہ پر ہوا: وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

اور الانفال کی پہلی آیت کا اختتام: اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ پر ہوا۔ اور دوسری آیت میں یہ وصف سرے سے بیان نہیں ہوا۔

(۵) الانفال کی دوسری آیت میں آلِ فرعون کے عذاب کی تفصیل بیان ہوئی' یعنی ان کے غرق کیے جانے کا ذکر ہوا۔ باقی دونوں آیات میں اس کا تذکرہ نہیں ہوا۔

(۶) سورۃ آل عمران کی آیت کی ابتدا ''كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ'' سے ہوتی ہے' تو شروع کے اس ''کاف'' کا تعلق کس سے ہے؟

یہ سوال ہماری اس کتاب کے موضوع سے تو متعلق نہیں ہے لیکن بطور تتمہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

اب جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل تینوں آسمانی کتابوں کے اتارے جانے کا ذکر تھا اور ان کتابوں میں جو ہدایت اور حق و باطل کے درمیان فرقان کا پہلو تھا' اس کی طرف بھی اشارہ تھا' اس لیے جن لوگوں نے ان کتابوں کا انکار کیا' ان کے لیے تکذیب (كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا) کی تعبیر مناسب تھی۔

اس کے مقابلے میں سورۃ الانفال کی پہلی آیت سے قبل کہیں بھی آسمانی کتب کے اتارے جانے کا ذکر نہیں ہے' ذکر ہے تو مسلمانوں کا اور معاصر کفارِ عرب کا جن کے ساتھ قتل و قتال کا چرچا ہے' اس لیے یہاں ''كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' کہنا ہی مناسب تھا۔ اور چونکہ اگلی آیت اس کے معاً بعد ہی آ رہی ہے۔ یعنی دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں ہے' اس لیے دوبارہ پھر ''كَفَرُوْا'' کی تکرار نہیں کی گئی' بلکہ ''كَذَّبُوْا'' کا لفظ لایا گیا تاکہ ان کفار کی دونوں خصلتیں (کفر اور تکذیب) ظاہر ہو جائیں۔

(۲) سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں ''اللہ'' کا نام خصوصی طور پر لایا گیا۔ فرمایا: ''كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل فرشتوں کا ذکر ہے اور ان سے ایک فعل منسوب کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾ (آیت ۵۰)

''کاش کہ تو دیکھتا جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور سرینوں پر ضرب لگاتے ہیں۔''

اور شیطان اور اس کے ایک فعل کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾

''اور جب شیطان نے ان کے سامنے ان کے اعمال کو سجا کے پیش کیا۔''

اس کے مقابلے میں سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل غیر اللہ کے نہ کسی فعل کا تذکرہ ہے اور نہ ایسے کسی فعل کی نسبت اللہ کے سوا کسی اور سے کی گئی ہے' اس لیے وہاں اللہ کے اسم ظاہر کے بجائے اللہ کی ضمیر کی طرف نسبت کی گئی' فرمایا ''كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' اور اس اسلوب کو 'التفات'' یعنی توجہ دلانا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الانفال میں اسم ظاہر لایا گیا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ہر امر اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہی انہیں نشانیاں دکھانے والا ہے' فعل ہے تو صرف اسی کا ہے' خود فرشتے بھی اس کے امر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں' ان کا عمل بھی اللہ ہی

کا پیدا کردہ ہے' اور شیطان کا یہ فعل کہ اس نے کفار کے اعمال کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تقدیر اور مشیت کی بنا پر ہے' یہ سب کچھ اس کا پیدا کردہ ہے' اس کی حکومت کا حصہ ہے' جو بھی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں' سب اسی کی نشانیاں ہیں' اور سب سے اعلیٰ اور ارفع مثال اس کے لائق حال ہے۔

اب رہا سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں ''بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ'' کا ذکر جبکہ پہلی آیت میں ''بِاٰیٰتِ اللّٰهِ'' کہا گیا تھا تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس دوسری آیت سے قبل اللہ کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾

(آیت ۵۳)

''اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہے بدلنے والا نہیں ہے' یہاں تک کہ وہ اپنی حالت کو بدل ڈالیں۔''

یہاں نعمت کا تذکرہ ہے' اس لیے ''بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ'' کہہ کر اس مالک اور محسن کے صفاتی نام ''رب'' کا تذکرہ مناسب تھا جس نے انہیں یہ نعمتیں عطا کیں اور پھر اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ سزا کے مستحق ہوئے۔

یہاں اگر صرف ''اللہ'' کا ذکر کیا جاتا تو وہ شدتِ کلام نہ پیدا ہوتی جو اللہ کی ربوبیت کی طرف اشارہ کر کے پیدا ہو رہی ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ غور کرو! وہ ذات کہ جس نے تمہیں ساری نعمتیں عطا کیں' جو تمہارا مالک ہے' تم اس کے احسانات کا بدلہ یوں چکا رہے ہو کہ کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو رہے ہو! اس طرزِ بیان میں ندامت و حسرت کی اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے جس سے یہ لوگ گزریں گے۔

مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ جس شخص نے اللہ کی نعمت کی ناقدری کی اسے اگر یوں کہا جائے کہ ''تم نے اپنے مالک' اپنے محسن' اپنے مربّی کے احسانات کی ناقدری کی ہے'' تو یہ اسلوبِ بیان کیا زیادہ بلیغ نہ ہو گا بہ نسبت یہ کہنے کہ ''تم نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے!''

اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی ابتدا میں جہاں خلائق کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے وہاں ربوبیت کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ﴾ (آیت ۲۱)

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔''

(۳) سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں آلِ فرعون کے غرق ہونے کا ذکر ہے اور پھر ان کے لیے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا گیا اور پہلی آیت میں بجائے ہلاکت کے ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ ارشاد فرمایا' اور وہ اس لیے کہ کلام میں تکرار نہ ہو اور اس لیے بھی کہ یہاں آلِ فرعون کی ہلاکت کی تفصیل بتائی جا رہی ہے کہ وہ غرق کیے گئے تھے' اس لیے ہلاکت کا لفظ مناسب تھا' اور پھر آخر میں ﴿وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۝﴾ کہہ کر دونوں فریق (غرق ہونے والے اور اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا بھگتنے والے) کا مجموعی تذکرہ ہو گیا۔

(۴) سورۃ الانفال میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾ کہا گیا' اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل کفار کو مخاطب کرتے ہوئے شیطان کا قول مذکور ہے:

﴿لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (آیت ۴۸)

''آج تمہارے اوپر کوئی غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔''

شیطان کی اس بڑ کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف قوت کا انتساب کیا گیا' جیسے سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آیت ۱۶۵)

''کاش کہ ظلم (یعنی شرک) کرنے والے جانتے جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت صرف اللہ کے پاس ہے۔''

اور چونکہ سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لیے صرف ﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ○﴾ کہنے پر اکتفا کیا گیا۔ سورۃ الانفال میں انہی وجوہات کی بنا پر نہ صرف شروع میں ''اِنَّ'' کا اضافہ ہے بلکہ اللہ کے صفاتی نام ''اَلْقَوِيُّ'' کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

(۵) اس سوال کا جواب تیسرے سوال کے جواب کے ضمن میں آ گیا ہے اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ آخری جگہ ہے جہاں قرآن میں آل فرعون کے جھٹلانے اور بوجہ کفر اُن کے پکڑے جانے کا ذکر ہے' اس لیے یہاں ان کا تفصیلی ذکر آ گیا۔ اور خیال رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے ذکر کی گئی ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ترتیب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دخل ہے تو اس کا خیال درست نہیں ہے' ہم اس بات کو سورۃ القمر کے ضمن میں بھی ذکر کریں گے۔

(۶) ﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾

''کاف'' کا تعلق مبتدأ مقدر سے ہے' گویا یوں کہا جا رہا ہے:

دَأْبُهُم او دأب هٰؤلاءِ او هذا كدأب آل فرعون

''ان کا' یا ان لوگوں کا' یا ایسا چال چلن آل فرعون کے چال چلن جیسا ہے''

اور جن لوگوں نے اس کی تقدیر ان الفاظ سے کی ہے' جیسے ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ ''یہ لوگ جہنمی ہیں' جیسے آل فرعون'' تو یہ تقدیر قابل قبول نہیں ہے اور الانفال کی دونوں آیتوں میں (جن کی ابتدا كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ) یہ تقدیر انتہائی ضعیف دکھائی دیتی ہے اور معنی بھی صحیح طریقے سے ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ کو اگر مستقل سمجھا جائے اور ماقبل سے اس کے اعراب کا تعلق نہ ہو تو نظم میں سلاست اور معنی میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳) آیت ۲۷:

﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ﴾

''تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔''

اور سورۂ یونس کی آیت ۳۱ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾

''پھر کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور زندہ کو مردے سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔''

اور ایسے ہی سورۃ الروم کی آیت ۱۹ میں۔

لیکن سورۃ الانعام کی آیت ۹۵ میں لفظ ''مُخْرِجُ'' آیا ہے یعنی اسم فاعل جو فعل کی جگہ لایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ﴾

''اور اللہ تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے' زندہ کو مردہ سے نکالنے والا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔''

تو اس کا کیا سبب ہے؟

جواباً عرض ہے' اور اللہ بہتر جانتے ہیں' کہ سورۃ الانعام کی اس آیت سے پہلے اسم فاعل لایا گیا ہے' یعنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ﴾ اور اگلی آیت میں بھی اسم فاعل لایا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا﴾ (آیت ۹۶) ''وہ صبح کو نکالنے والا ہے' اور اس نے رات کو راحت بنایا ہے''۔ اور جب یہ آیت دو اسم فاعل کے درمیان آ رہی ہے تو یہاں بھی ﴿وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ﴾ کہہ کر اسم فاعل لایا گیا' یعنی مُخْرِج کا عطف فَالِق پر ہے اور اس کے بعد بھی ''فَالِقُ الْاِصْبَاح'' ایک دفعہ پھر لایا گیا ہے' لیکن باقی آیات میں اس طرح کا نظم نہیں ہے' اس لیے وہاں اسم فاعل لانے کی ضرورت نہ تھی' واللہ سبحانہ اعلم!

لیکن اگر تم یہ کہو کہ اسی آیت میں ﴿یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ﴾ کہہ کر فعل لایا گیا ہے حالانکہ اس سے قبل بھی تو اسم فاعل موجود ہے (یعنی ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ﴾ اور اس کے بعد بھی اسم فاعل ہے' یعنی ﴿وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ﴾؟

اس کا جواب زمخشری نے خوب دیا ہے کہ ﴿یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ﴾ دراصل ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ﴾ کے لیے بطور بیان ہے' کیونکہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنا نباتات سے متعلق ہے' گویا خشک میوہ کا اس طرح پیدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے مردہ سے زندہ کو پیدا کیا جائے۔ خشک چیز بمنزلۂ حیوان ہے' جیسے زمین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ﴾ (الروم:۱۹)

''اور زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔''

یہ وضاحت زمخشری کی حسنات میں سے ہے۔

(۴) آیت ۲۸:

﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾﴾

''اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے' اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

اور پھر آیت ۳۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾

''اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے' اور اللہ بندوں پر بہت شفقت کرنے والا ہے۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ دونوں آیات کا آخری ٹکڑا کیوں مختلف ہے؟ یعنی ایک آیت کے آخر میں ﴿وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾﴾ آیا اور دوسری آیت میں ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾ لایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت سے ماقبل کا مضمون اس طرح ہے۔ فرمایا:

﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ﴾ (آیت ۲۸)

''ایمان والے اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست نہ بنائیں۔''

اور پھر اس پر ان الفاظ میں ایک سخت وعید سنائی:

﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ﴾ (آیت ۲۸)

''اور جو ایسا کرتا ہے تو اللہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں۔''

اور پھر اس میں صرف ایک استثناء رکھا اور وہ تھا حالت خوف کا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ۭ﴾ (آیت ۲۸)

''سوائے اس کے کہ تم ان سے ڈرتے ہو۔''

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ۭ﴾ ''اور اللہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے آپ سے'' یعنی اس کے عذاب سے۔ اور پھر فرمایا: ﴿وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

گویا تمہارے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔ یہ سارے کا سارا مضمون نگینہ کی مانند زیور میں جڑا ہوا ہے۔ اور پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ۭ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾﴾

''کہہ دیجیے' جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے' تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے' اور وہ بھی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اور یہاں یہ بتا دیا کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ لوگ جو کہ مُردوں کے اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں' اپنا سارا استدلال انہی دونوں صفات (علم اور قدرت) کے انکار پر ٹھہرائے ہوئے ہیں' اور اگر ان دونوں صفات کا اثبات کر دیا جائے تو ان کی دلیل کی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس آیتِ عظیمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت جزئیات کا بھی احاطہ کرتی ہے' اس کے علم اور قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی طرف لوٹنا حق ہے۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ بندوں کے اعمال' چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے' سب کے سب گنے چنے ہیں' فرمایا: ﴿یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ ۚ﴾ (آیت ۳۰) ''اُس دن ہر نفس ہر اُس خیر یا شر کو جو اُس نے کیا تھا' حاضر پائے گا''۔ پھر دوبارہ اس بات کا اعادہ کیا: ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ۭ﴾ ''اور اللہ تمہیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے''۔ اور پھر اپنی رحمت و شفقت کا تذکرہ فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾

[یہاں ہم ابن عاشور کی عبارت کا سہارا لیتے ہیں کہ جس سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ مترجم]

پہلی آیت میں اس بات سے ڈرایا ہے کہ کفار سے دوستی نہ کرو اور یہ جو تم تقیہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہو اس میں تساہل نہ کرو اور چونکہ یہ دونوں باتیں سخت قسم کی ہیں اس لیے آخر میں ﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾﴾ کہا' تاکہ اس ڈرائے جانے کی تاکید ہو جائے' یعنی پھر اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے' ایسا کرو گے تو پھر کہاں جاؤ گے؟ اس کے مقابلے میں دوسری آیت میں اپنے اعمال کے' روزِ قیامت سامنے حاضر کیے جانے کا بیان ہے۔ یہاں ڈرائے جانے میں ایک قسم کی نصیحت غالب ہے کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے' اور پھر ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾ کہہ کر ایک قسم کی بشارت اہل ایمان کو دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت بے پایاں ہے' تم اپنی طرف سے کوتاہی نہ کرو' واللہ اعلم!

(۵) آیت ۴۰:

حضرت زکریا علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا:

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ﴾

''کہاں سے ہوگا میرا بچہ حالانکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔''

اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾﴾

''کہاں سے ہوگا میرا بچہ اور میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔''

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں جگہ بات ایک ہی ہے لیکن سیاق مختلف ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۂ مریم ابتداءِ سورت سے قصہ مریم تک فواصل آیات (یعنی آیت کا آخری لفظ) ایک جیسے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾﴾

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾﴾

اور پھر یہ فواصل آیات حضرت مریم کے قصے کے آخر تک یوں ہی چلے جاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾﴾

اور پھر آیت ۴۱ سے دوبارہ یہی فواصل شروع ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾﴾

اور سورت کے آخر تک ایسے ہی چلے جاتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں گو آیت آل عمران کے مقابلے میں تقدیم و تاخیر ہے لیکن فاصلے کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے روا رکھا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کا نظم اس طرح کے ایک فاصلے کا پابند نہیں ہے' اس لیے وہاں جس طرح آیت کو لایا گیا ہے وہی مناسب ہے' واللہ اعلم!

(۶) آیت ۴۱:

حضرت زکریا علیہ السلام کا قول:

﴿رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ﴾

’’اے رب میرے لیے ایک نشانی دکھا دے۔‘‘

یعنی بیوی کے حاملہ ہونے پر کوئی نشانی تا کہ یہ اچھی خبر جلد علم میں آ جائے۔ تو کہا گیا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ﴾ (آیت ۴۱)

’’تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن تک بات نہیں کرو گے مگر اشاروں میں‘‘

اور سورۂ مریم میں اسی قصے کے ضمن میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰﴾ (مریم)

’’تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین راتیں صحیح سلامت ہونے کے باوجود لوگوں سے بات نہ کرو گے۔‘‘

تو اس اختلاف کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ مقصود یہ تھا کہ ان کا بات چیت سے روکا جانا تین دن اور تین راتوں کے لیے تھا' اور اس بات کو بالکل واضح کرنے کے لیے ایک جگہ دن کا اور دوسری جگہ رات کا بھی تذکرہ کر دیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے قومِ عاد پر آندھی کے عذاب کا تذکرہ کیا گیا اور وہاں رات اور دن دونوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا' فرمایا:

﴿سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا ﴾ (الحاقۃ:۷)

’’اور اسے ان پر لگاتار سات رات اور آٹھ دن مسلّط کیے رکھا۔‘‘

دونوں اوقات کا خاص طور پر ذکر آ گیا تا کہ یہ وہم باقی نہ رہے کہ یہ عذاب صرف دن کے وقت تھا یا صرف رات کے وقت تھا۔ اسی طرح حضرت زکریاعلیہ السلام کے قصے میں سورۂ آل عمران کی آیت میں دن کا ذکر ہے جس کی مناسبت ’’رَمْزًا‘‘ سے ہے۔ ’’رمز‘‘ اشارے کو کہتے ہیں کہ بغیر بولے بات کو سمجھنا' اس میں آنکھ اور ہاتھ کا اشارہ بھی آ جاتا ہے اور بقول مجاہد ہونٹوں کا اشارہ بھی شامل ہے' اور یہ تمام اشارے آنکھ سے دیکھنے کے پابند ہیں' اس لیے دن کا ذکر کیا گیا۔ سورۂ مریم کی آیت میں چونکہ ’’رمزًا‘‘ کا ذکر نہ تھا اس لیے رات کا ذکر کر دیا' اور ’’رمز‘‘ کے بجائے وہ لفظ لایا گیا کہ جس سے راتوں کے برابر ہونے کا مفہوم واضح ہو گیا' یعنی زکریاعلیہ السلام بات نہ کر سکیں گے اور اس میں تمام راتیں برابر ہیں۔ یہاں لفظ ’’سَوِیًّا‘‘ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور اعراب کے لحاظ سے وہ ’’لَیَال‘‘ کے لیے ’’حال‘‘ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اسے لفظ ’’اَلَّا تُكَلِّمَ‘‘ کی ضمیر مخاطب سے بھی حال مان سکتے ہیں اور پھر معنی یہ ہوگا کہ تمہیں بات چیت سے روک دیا گیا ہے حالانکہ نہ تم گونگے ہو گے' نہ کوئی اور بیماری کا شکار ہو گے۔ لفظ ’’سَوِیًّا‘‘ کے آخر میں لائے جانے میں آیات کے فواصل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس طرح کے فواصل نہیں ہیں اس لیے وہاں خاص طور پر یہی لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی' اور اس طرح یہ بات عیاں ہو گئی کہ ہر دونوں سورتوں میں مذکورہ الفاظ کا اپنی اپنی جگہ لایا جانا ہی مناسب تھا' واللہ اعلم!

(۷) آیت ۴۸۔۴۹:

﴿وَیُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝۴۸ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ اَنِّیْ قَدْ

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ﴾

''اور وہ انہیں کتاب اور حکمت (یعنی) تورات اور انجیل کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں' پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے' اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور مُردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتا ہوں' اور تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًا ۢ بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ ۚ﴾

''اور جب تم مٹی سے پرندے کی شکل میرے اذن سے بناتے تھے' پھر اس میں پھونکتے تھے تو وہ میرے اذن سے پرندہ بن جاتا تھا' اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے اذن سے اچھا کر دیتے تھے' اور جب تم مُردوں کو میرے اذن سے کھڑا کر دیتے تھے۔''

یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) پہلی آیت میں ضمیر مذکر ہے (فَاَنْفُخُ فِیْهِ) اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث ہے (فَتَنْفُخُ فِیْهَا)

(۲) پہلی آیت میں کلام میں تفصیل ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کی طرف اسم ظاہر سے کی گئی ہے (یعنی بِاِذْنِ اللّٰهِ کہا گیا ہے)۔ لیکن دوسری آیت میں کلام مختصر ہے اور چار جگہوں پر ان معجزات کے ضمن میں اللہ کی ضمیر متکلم (بِاِذْنِیْ) کی طرف کی گئی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

پہلا سوال کہ پہلی آیت میں ضمیر مذکر (فِیْهِ) لائی گئی ہے اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث (فِیْهَا) لائی گئی ہے تو زمخشری نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ پہلی آیت میں ضمیر لفظ ''طَیر'' (پرندے) کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اے عیسیٰ! جو چیز تم پرندے کی شکل میں بنا رہے ہو' تم اس میں پھونکتے ہو' گویا شکل کی ابتدائی حالت (هَیْئَة) کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ اس کی انتہائی شکل یعنی ''طَیر'' کا اعتبار کر کے ضمیر مذکر لائی گئی اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث لفظ ''هَیْئَة'' کی طرف لوٹتی ہے' یعنی وہ شکل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی سے بنائی تھی' اور ایسے ہی یہاں ''تَكُوْنُ'' کہہ کر مؤنث کا صیغہ لایا گیا' کیونکہ اس سے مراد ''هَیْئَة'' ہے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ ہر آیت میں اسلوبِ بیان مختلف کیوں ہے' پہلی آیت میں سارا کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے' کلام میں تفصیل ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کے اسم ظاہر کی طرف کی گئی ہے اور دوسری آیت میں کلام میں اختصار ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کی ضمیر متکلم کی طرف کی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو زمخشری کا جواب تھا' ہم مزید کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

ضمیر کا لفظ کی طرف لوٹنا معنی کی طرف لوٹنے کے اعتبار سے اولیٰ ہے' اصل میں ضمیر کاف (کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ) کی طرف لوٹ رہی ہے' کاف ''مثل'' کا بدل ہے' اس لیے یہاں مذکر ضمیر لائی گئی اور سورۃ المائدۃ میں ''کاف'' معنی کے اعتبار سے ''صفت'' کا بدل ہے' اس لیے مؤنث ضمیر لائی گئی۔ اس کی ایک اور مثال لے لیں۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا﴾ (آیت ۳۱)

''اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی۔''

یہاں ''مَنْ'' کے اعتبار سے ''يَقْنُتْ'' میں فعل مضارع کا مذکر کا صیغہ لایا گیا اور پھر معنی کے اعتبار سے کہ یہاں ازواج النبی (رضی اللہ عنہن) کا ذکر ہو رہا ہے ''تَعْمَلْ'' کہہ کر مؤنث کا صیغہ لایا گیا۔ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

اور سورۃ آل عمران چونکہ قرآنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ہے' اس لیے وہاں لفظ کا اعتبار کر کے مذکر کی ضمیر لائی گئی اور سورۃ المائدۃ چونکہ بعد میں ہے اس لیے وہاں معنی کا اعتبار کر کے مؤنث کی ضمیر لائی گئی۔

ایک دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ ذرا سورۂ آل عمران کا سیاق ملاحظہ فرمائیں:

آیت نمبر ۴۴ ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ سے لے کر آیت ۴۹ (فَاَنْفُخُ فِيْهِ) تک کوئی بیس ضمائر آئی ہیں اور سب کی سب مذکر ہیں' اس لیے ''فَاَنْفُخُ فِيْهِ'' میں بھی اسی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے ضمیر مذکر لائی گئی۔

لیکن سورۃ العقود (المائدۃ) میں اس قصے کی ابتدا وَاذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ (آیت ۱۱۰) سے ہو رہی ہے' جہاں پرندے کی شکل بنانا اور پھر اس میں پھونکنے کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں' تو ''نعمت'' کے اعتبار سے یہاں ضمیر مؤنث لائی گئی' اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ اس سیاق میں ضمائر اس کثرت سے نہیں ہیں جیسے آل عمران میں ہیں۔ اور اس اعتبار سے دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر مناسب الفاظ کے ساتھ آئی ہیں۔

دوسرے سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت میں لفظ ''بِاِذْنِيْ'' چار مرتبہ استعمال ہوا ہے اور وہ اس لیے کہ سورۃ آل عمران میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا بیان ہوا ہے وہاں ایک تو مریم سلامٌ علیہا کو بشارت دی جا رہی ہے کہ تمہارے بیٹے کو یہ یہ انعامات دیے گئے اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان معجزات کو اللہ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اپنی قدرت کی بنا پر کیا' بلکہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوا۔

اور سورۃ المائدۃ کی آیت میں مقصود کچھ مختلف ہے' وہاں اصلاً نصاریٰ کے شرک اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے دعوائے الوہیت کی تردید کی جا رہی ہے لیکن اسلوب' عتاب اور سرزنش کا ہے' یعنی مخاطب تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں لیکن کلام سے مقصود نصاریٰ کو تنبیہ کرنا ہے' اور یہ اسلوبِ کلام ہمارے ہاں معروف ہے۔

دیکھئے' ایک آقا اپنے غلام کو' جو اُسے انتہائی پیارا ہے اور جس نے کبھی اس کی نافرمانی نہیں کی' لوگوں کے

سامنے ان الفاظ میں ڈانٹتا ہے: کیا میں نے تمہارے لیے یہ اور وہ نہیں کیا؟ کیا میں نے تمہیں یہ کچھ عطا نہیں کیا؟ اور پھر اپنے چند احسانات اس پر گنوا کر کہتا ہے: کیا یہ سب میرے علاوہ کسی اور نے دیا ہے؟ تم نے فلاں پر احسان کیا تو وہ میرے عطا کردہ مال ہی سے تو تم نے دیا؟ تم نے فلاں دشمن کو زیر کیا تو وہ میری مدد سے ہی ایسا کیا؟ اور یہ سب سنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ اس غلام نے اگر کسی پر احسان کیا ہے یا اپنے کسی دشمن کو زیر کیا ہے تو وہ صرف اور صرف اپنے آقا کی قدرت اور اعانت سے کیا ہے اور پھر جب غلام بھی اس بات کا اعتراف کر لے کہ جو کچھ آقا نے کہا ہے درست ہے' تو اب کسی کو یہ وہم وگمان نہ رہے گا کہ غلام نے سب کچھ خود کیا تھا اور وہ آزادی سے جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔

بالکل اسی انداز میں یہ آیات وارد ہوئی ہیں' عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے' جیسے پرندے کا بنانا' اس میں پھونک مارنا' اندھے اور کوڑھی کو شفایابی سے ہمکنار کرنا' مُردوں کو زندہ کرنا' ان کے ساتھ بار بار چار مرتبہ ''بِاِذْنِی'' لایا گیا تاکہ نصاریٰ جن معجزات کے دیکھے جانے پر گمراہ ہوئے اور تثلیث کے مرتکب ہوئے' ان کی حقیقت واضح ہو سکے اور ان کے انتہائی لغوقول کی تردید ہو سکے۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ﴾ (المؤمنون: ۹۱)

''اللہ نے اپنا کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔''

اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ یہ سارے معجزات اللہ کے اذن سے وقوع پذیر ہوئے اور ''باذنی'' کی تکرار سے اس بات کی تاکید ہوگئی کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس بات کی نفی کر دی گئی کہ یہ سارے معجزات ان کا اپنا فعل نہ تھا۔

اور پھر انہی باتوں کی مزید تاکید کے لیے سورۃ المائدۃ کی اگلی آیات لائی گئیں جہاں ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

''اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود قرار دے دو؟''

اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ملاحظہ فرمائیے کہ جس سے نصاریٰ کو ڈانٹ پلانا مقصود تھا:

﴿مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

اور پھر اپنے رب کی تنزیہہ اور ان کے افتراءات سے اپنی براءت اور اللہ کے سامنے مکمل عاجزی کا یوں اظہار کیا:

﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

اب واضح ہو گیا کہ سورۃ آل عمران کی آیات میں حضرت مریم کو بشارت دینا مقصود ہے اور سورۃ المائدۃ کی آیات میں گو خطاب حضرت عیسیٰؑ سے ہے لیکن مقصود نصاریٰ کی سرزنش ہے' اور اسی وجہ سے دونوں جگہ اندازِ بیان مختلف ہے۔